مسلمان ممالک کی تاریخ میں حقوقِ نسواں اور عائلی قوانین کی تعبیر نو کا تجزیاتی مطالعہ

THE INTERPRETATION OF WOMEN RIGHTS AND FAMILY LAWS IN THE HISTORICAL CONTEXT OF MUSLIM COUNTRIES: AN ANALYTICAL STUDY

صلاح الدین*

شمائلہ کمال**

ABSTRACT

Modernization put aside politics initially and positioned away the religious matters. Gradually the family and social affairs were stated as personal matters. This divergence started from Christianity and shifted to Islam. In the subcontinent during British rule these trends were enacted particulary, termed as "Muslim Personal Law". In Islam sovereignty is considered the only right of Allah Subhanahu wa ta'ala, the creater. Creations are subordinates of their Creator. The true Islamic sources of Sharia provide complete guidance for individual and family rights. This study persuaded in an analytical way to response the historical analysis of family laws in Muslim World. All these reformings were conducted by the reasoning and legical exertations of academics from various schools of thought in Islamic Jurisprudence. The first step of transformation in Islamic family laws was held by the reframing of "Islamic Family Laws" to "Muslim Family Rights" under Ottoman Empire in 1917. Later in 1939 such a revolution in Nikah and divorce (separation) laws was conducted in the Subcontinent. These amendments were conducted by the referencing and recommendation of muslim rationalists.

KEYWORDS: Muslim Personal Law, Family Laws, Women Rights, Sharia Courts, Muslim Jurists, Muslim Countries

* اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامیات، لسبیلہ یونیورسٹی آف ایگریکلچر، واٹر اینڈ میرین سائنسز، بلوچستان hafizsalahuddinis@yahoo.com

** لیکچرار، سوشیالوجی، لسبیلہ یونیورسٹی آف ایگریکلچر، واٹر اینڈ میرین سائنسز، بلوچستان shumailakamal88@gmail.com

تمہید

یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ کا دور آیا تو سیاست کو مذہب سے بالکل الگ کر دیا گیا، مذہب کو پرائیویٹ معاملہ قرار دیا گیا۔ خدا کا عقیدہ، اس کی پرستش اور نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ مسائل کو 'شخصی' کہا گیا۔ اسی تصور کے پیش نظر ہندوستان میں انگریزوں نے اس طرح کے مسائل کے لیے 'مسلم پرسنل لا' کی اصطلاح وضع کی[1]۔ اس کے برعکس اسلام نے حقوق و فرائض کا جو نظام عطا کیا ہے، وہ باعتبار خالق و مخلوق ہے نہ کہ باعتبار ریاست (اسٹیٹ) اور شہری۔ جمہوری نظام میں اسٹیٹ کو اصل قرار دیا جاتا ہے، لیکن اسلامی نظام اور سیاست شرعیہ میں خالق کائنات، رب العالمین اور پروردگار عالم اصل ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ گھریلو زندگی، معاشی معاملات، معاشرتی نظام یا سیاسی امور ہوں اللہ کے احکامات کی پیروی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے جن حقوق کو اس نے حقوق کہا ہے، وہی حقیقی حقوق ہیں، جو اسے ملنے چاہیے، اسی طرح جو فرائض اس نے انسان پر عائد کیے ہیں، ان کی بجاآوری اس کے لیے نہ صرف ضروری ہے، بلکہ وہ اس کا مقصد زندگی ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون میں حق کا تصور غیر اسلامی قانون سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے، غیر اسلامی سیاسی نظام میں اعطائے حق حکومت کا حق ہے اور حکومت بالآخر انسانوں سے ہی بنتی ہے، جبکہ اسلامی سیاسی نظام یا سیاست شرعیہ میں عطائے حق صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اس لیے غیر اسلامی قانون میں حکومت اکثریت کے زور و قوت پر کسی بنیادی حق کو سلب کر سکتی ہے، جبکہ اسلامی قانون میں جس طرح اعطائے حق کا حق حکومت اور قانون کو نہیں ہے، اسی طرح سلب حق کا حق بھی حکومت اور قانون کو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنے شہریوں کے تمام حقوق ادا کرے بلکہ ان کی حفاظت بھی کرے، جو کہ خالق کائنات نے انہیں عطا کیے ہیں۔ اس طرح ریاست (حکومت) اور حاکم کی حیثیت امین کی ہوتی ہے یا اس محافظ کی ہوتی ہے جو کسی خزانہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔[2]

اسلوبِ تحقیق

زیر بحث تحقیق میں اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی تاریخ میں معاشرتی اور سماجی تبدیلیاں اور خاص کر عائلی حقوق و قوانین کو تجزیاتی اسلوبِ تحقیق کے اصول و قواعد کے مطابق مدون کیا گیا ہے اور ضرورت کے مطابق بنیادی مصادر جبکہ تاریخی مراحل کی چھان بین کے لیے ثانوی مصادر سے استفادہ کیا ہے۔

برصغیر میں عائلی حقوق کی تعبیر نو کا تجزیاتی مطالعہ

ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں سارے انتظامات اسلامی شریعت کے تحت چلائے جاتے تھے اور اس قدر مؤثر تھے کہ وارن ہیسنگز کے زمانے میں جب کہ مغل حکومت مکمل طور زوال پذیر ہو چکی تھی، گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک نوٹ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ کوئی بھی شخص بنگال کے ایک سرے سے دوسرے تک بے خوف وخطر سفر کر سکتا ہے سوائے جنگلی جانوروں کے خطرے کے۔ گورنر جنرل نے لا اینڈ آرڈر کے اس اعلیٰ ترین معیار کا سبب ہندوستان میں رائج منصفانہ انتظام کو بتایا، جس کی بنیاد شرعی قوانین تھے۔[3]

ہندوستان میں مغربی تسلط کا دور اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کے لیے تاریک ترین دور تھا، ایک طرف تو غیروں کے تسلط کی وجہ سے ان کے عائلی قوانین ٹھیک ٹھیک قرآنی ہدایات کے مطابق نہ رہے، دوسری طرف ہندوؤں کے شب وروز اختلاط نے ان کے معاشرے میں بے شمار ایسی رسمیں پیدا کر دیں جو نہ صرف اسلامی اصولوں کے بالکل خلاف تھیں بلکہ بڑی انسانیت سوز، انتہائی وحشیانہ اور سخت ظالمانہ تھیں، اس طرح اس قوم نے جس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے ایک متوازن اور سو فیصد فطری نظام موجود تھا، غیروں کے طور طریقے اختیار کر کے اپنے آپ کو تباہ کن رسموں میں جکڑ لیا، حالات کی اس تبدیلی کا سب سے برا اثر بیچاری عورت پر پڑا اور اس تمام عرصہ میں یہ غریب ظلم وستم کے دہکتے الاؤ میں پڑی سسکتی رہی۔[4]

انگریزوں سے قبل برصغیر میں خواتین کی تعلیم عام تھیں سر سید احمد خان نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے مسلم عورتوں کی تعلیم کے مسائل پر بیان دیتے ہوئے کہا شریف خاندانوں کی مسلم عورتوں میں ایک قسم کی معتدل درجے کی دیسی تعلیم جاری ہے اور وہ مذہبی اور اخلاقی کتابیں اردو، فارسی اور عربی میں پڑھتی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو پیش کیا اور ان کے بارے میں کہا کہ وہ نہ صرف فارسی اور عربی کا بہت علم بلکہ اپنی زبان میں نظمیں کہنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اعلیٰ درجے کے خاندانوں میں ایسی خواتین بھی حال ہی میں گزری ہیں جو اعلیٰ درجے کی صلاحیت کا ملکہ رکھتی تھیں۔ اس ضمن میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے خاندان کی ایک خاتون کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے سر سید نے کہا کہ انہیں عربی کی مذہبی کتابوں پر اس قدر ملکہ تھا کہ وہ عورتوں کے درمیان مذہب اور اخلاقیات پر وعظ کرتی تھیں انہوں نے مزید بات کرتے ہوئے ایجوکیشن کمیشن کو آگاہ کیا کہ شریف خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کے لیے استانیاں اور ملانیاں رکھنے کا اب بھی دستور قائم ہے۔[5]

برصغیر پاک وہند میں عائلی قوانین کی ابتدا ۱۸۶۰ء سے ہوتی ہے، جب انگریز حکومت نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے یہ قانون بنایا کہ پرسنل لاز کے معاملے میں دونوں اقوام کا فیصلہ الگ الگ قوانین کے تحت ہوا کرے گا۔ مسلمانوں کے لیے وضع کیے جانے والے قوانین کو محمڈن لاء سے تعبیر کیا گیا۔ یہ محمدن لاء اسلامی قانون کی ایک محرف شکل تھی، جس پر مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے احتجاج کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ چونکہ اسلامی فقہ کے مطابق بعض عائلی مسائل میں قاضی کا مسلمان ہونا لازمی ہے جبکہ مذکورہ ایکٹ تعزیرات ہند 1860ء کے مطابق غیر مسلم بھی منصف بن سکتے ہیں۔ اور عائلی مسائل میں مسلمانوں کو ان کا فیصلہ ماننا لازمی تھا۔ لہذا مسلمانوں کے اس احتجاج کے پیش نظر بیس برس بعد یعنی 1880ء میں محمدن لاء کی بجائے "قاضی ایکٹ" کے نام سے نیا قانون مرتب ہوا۔ جس کے ذریعے مختلف جگہوں پر شرعی قاضی مقرر ہوئے اور ساتھ ہی مسلم عائلی قوانین میں سے چند امور مثلاً نکاح، طلاق، فسخ نکاح اور خلع وغیرہ کو قاضی ایکٹ میں شامل کر لیا گیا اور اس طرح پہلی صورت ختم ہو گئی۔[6]

قانون نکاح صغار

جدید دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک اور ادارے اس بات پر متفق ہیں کہ Teens یعنی تیرہ سال سے لیکر انیس سال کی عمر کی لڑکیاں ہر طرح کی جنسی تعلقات رکھنے، اس کے نتیجے میں بچے پیدا کرنے اور تنہا پالنے میں اسے اجازت حاصل ہے، لیکن کسی ملک میں والدین کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اسی عمر میں اپنی لڑکی کی شادی کرائے، بغیر شادی کے ناجائز تعلقات کی آگاہی مہم، مانع حمل ادویات، اسقاط حمل اور Shelter (پناہ گاہیں) اور کہیں Foaster Home (پرورش گاہ) کا جال بچھایا گیا ہے، اس لیے گیلپ پول (Gallup Poll) کے مطابق اس وقت پوری دنیا میں تیرہ فیصد کمسن بچیوں کے گھروں میں ناجائز تعلقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے موجود ہیں، جبکہ امریکہ اور کینیڈا ریجن میں یہ تعداد انیس فیصد ہے، ایک شماریاتی ادارے (Child Trend Data Bank) کے مطابق بغیر باپ کے ماؤں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے ۱۹۶۰ء میں پانچ فیصد ۱۹۵۵ء میں تینتیس فی صد اور ۲۰۰۸ء میں یہ تعداد اکتالیس فیصد ہو گئی ہے۔[7]

قانون صغار ۱۹۲۹ء کا پس منظر

برصغیر پاک وہند میں کم عمری کی شادی کا بل انگریز دور حکومت میں ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں منظور کیا جس کے تحت لڑکی کی عمر سولہ سال اور لڑکے کی عمر اٹھارہ سال مقرر کر دی گئی، ۱۹۲۹ء میں برطانوی فلاسفر

برٹرینڈ رسل کی کتاب Marriage and Moral شائع ہوئی وہ اس سے پہلے بھی اس موضوع پر کافی کتابیں لکھ چکا تھا اور بے شمار لیکچر دے چکا تھا اس کتاب میں اس نے جنس، شادی اور اخلاقیات پر ایک ایسی بحث چھیڑی، جس نے خاندانی نظام جیسے مقدس رشتے کی پاکیزگی و پارسائی کے تصور کے خاتمے کی بنیاد رکھی۔ اس نے جنسی ضروریات کو شادی کے ادارے سے بالکل الگ کر کے ایک ایسی بھوک سے تعبیر کیا، جس کی تسکین ہر حال میں ضروری ہے اور اسے شادی جیسے مشکل، کڑے اور سخت بندھن کے ساتھ جوڑنا ضروری نہیں ہے، اس کے نزدیک جوانی کھیل کود عیش و عشرت کا نام ہے اور اس دوران آدمی کو کھیل کود اور جنسی تجربات سے گزر کر شادی اس وقت کرنی چاہئے جب وہ معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر پختہ ہو جائے اس نظریہ کو اس وقت خوب پذیرائی حاصل ہوئی اور اسی نظریہ کی بنیاد پر ٹین ایجز کی شادی پر پابندی عائد کر دی گئی۔[8]

آرڈیننس کی دفعہ نمبر ۱۲ کے تحت سولہ سال سے کم عمر لڑکی کو صغیرہ قرار دیا گیا جس کا نکاح ''قانون نکاح صغار ۱۹۲۹ء'' کے تحت جرم مستلزم سزا ہے۔ یہ دفعہ وضع کرتے وقت معاملے کے سارے پہلو سامنے نہیں رکھے گئے، اس کی بجائے اگر یوں ہوتا کہ صغیرہ کا محض نکاح کیا جاسکتا ہے، رخصتی بلوغ کے بعد ہی ہو تو بھی اس دفعہ کا منشا پورا ہو سکتا تھا۔[9]

دو سو سال کی طویل جدوجہد اور جان و مال کی بیش بہا قربانیوں کے بعد مسلمانوں نے اپنے لیے ایک آزاد اسلامی مملکت حاصل کر لی، جن امنگوں اور ولولوں سے ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا ان کا تقاضہ یہ تھا کہ یہاں پہنچ کر ہم زندگی کے ہر شعبے میں ان آلائشوں سے اپنے دامن جھاڑ لیں جو غیروں کے ساتھ میل جول کے سبب ہم پر مسلط ہو گئی تھیں اور اسی ضمن میں ان تمام گندگیوں سے بھی اپنے آپ کو پاک کر لیں جو ہماری عائلی زندگی میں بری طرح گھس آئی تھیں اور پھر از سر نو اپنی زندگیوں کو اسلامی نظام حیات کے اس دلکش سانچے میں ڈھالیں جو ہمیشہ ہماری کامیابی اور کامرانی کا ضامن رہا ہے۔[10]

انگریز دور حکومت اور مسئلہ وراثت

اس بحث کا دروازہ اوّل اوّل مسلمانوں میں اس وقت کھلا ہے جب سے انگریزی حکومت کے تحت ہندوانہ رواجی قانون وراثت نافذ ہوا۔ رواجی قانون سے جہاں مسلمانوں نے یہ اثر لیا کہ لڑکیوں کو بالکل محروم کر دیا (اور لڑکیوں کو شریعت کے دیے ہوئے حق وراثت سے محروم کرنے ہی کے لیے وراثت کے شرعی قانون پر مسلمان کھلم کھلا رواجی قانون کو ترجیح دیتے رہتے ہیں، نیز قانون شریعت کے نفاذ کے بعد بھی لڑکیوں اور بہنوں سے دستبرداری کے بیانات

دلوادلوا کر ان کی حق تلفی کرتے ہیں۔) ان میں میت کے زندہ بیٹوں کے حصص کے ساتھ ان کے مردہ بیٹوں کے حصوں کو زندہ رکھ کر یتیم پوتوں کو وارث قرار دینے کی تڑپ بھی پیدا ہو گئی۔ کسی کی بیوہ بہن، یتیم بھانجی یا نواسی، بلکہ خود یتیم پوتے کی ماں، یعنی بیوہ بہو کے لیے کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی ساری توجہ یتیم پوتے کے ایک ہی مسئلہ پر مرتکز ہے۔ اس سے پہلے پوری تاریخ اسلام و مسلمین میں اس بحث کے آثار نہیں ملتے۔[11]

1864ء تک ہندوستان میں شرعی عدالتیں قائم تھیں اور مسلمانوں کے شرعی معاملات کے فیصلے مسلمان قاضی کرتے تھے، جن کا انتخاب علماء کی جماعت سے کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے شرعی عدالتیں ختم کر دیں۔[12] برصغیر ہند و پاک میں اسلامی عائلی قوانین میں اصلاح کا پہلا قدم قانون انفساخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء کی منظوری تھا۔[13] مفکر اسلام علامہ محمد اقبال اسلامی ممالک میں جدت کے علمبرداروں سے بدگمان نظر آتے ہیں اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ تجدید کی دعوت کہیں تقلید فرہنگ کا بہانہ اور پردہ نہ ہو، کہتے ہیں:

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[14]

افریقہ اور عرب ممالک میں عائلی حقوق و قوانین کی تعبیر نو کا مطالعہ

سلطنت عثمانیہ نے ۱۹۱۷ء میں عائلی قانون کو حقوق العائلہ کے نام سے نافذ کیا۔ یہ اسلامی دنیا میں پہلا مدون عائلی قانون تصور کیا جاتا ہے۔ حقوق العائلہ العثمانی کی تدوین سے پہلے مسلم ممالک میں قاضی حضرات نصوص شرعیہ اور فقہی کتابوں میں ذکر شدہ فقہی احکام کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔[15] البتہ احوال شخصیہ کے نئے قوانین میں صرف فقہ حنفی پر انحصار نہیں کیا گیا بلکہ ضرورت کے مطابق تمام فقہاء کے اجتہادات سے استفادہ کیا گیا۔[16]

مصر تو جغرافیائی محل وقوع اور بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر تجدد کے اس سیلاب سے بہت زیادہ متاثر ہوا حتیٰ کہ بعض اہل فکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ مصر کو شرق کا ایک حصّہ اور مصری فکر کو ہندوستان یا چین کی طرح شرقی فکر کہنا ہی نادانی ہے مغربیت سے مرعوب ایک مصری مفکر نے یہ بھی کہہ دیا کہ انا کافر بالشرق ومؤمن بالغرب[17]۔

۱۹۲۰ء میں حکومتِ مصر نے ایک کمیشن قائم کیا اور اس کی عائلی قانون سے متعلق مجوزہ سفارشات کو بحیثیت قانون نافذ کر دیا اس قانون سے قبل مصر میں ضابطہ تنظیم عدالت ہائے شرعیہ مجریہ ۱۹۱۰ء کی دفعہ ۲۸۰ کے تحت شخصی معاملات میں امام ابو حنیفہؒ کے مفتیٰ بہ اقوال پر عملدرآمد ہوتا تھا۔[(18)] مصر میں محمد علی ۱۸۰۵ء میں برسر اقتدار آیا تو اس نے زندگی کے مختلف شعبوں کو مغربی طرز پر منظم کیا اس نے غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کیں، جس سے

مغربی اثرات مصر میں شدت کے ساتھ داخل ہوئے، محمد علی نے عورتوں کے حقوق کی طرف بھی توجہ دی اور دیگر معاشرتی اصلاحات کیں۔ ان شعبوں میں سے اس کے اقدامات نے ایسی معاشی، فکری، ثقافتی اور تعلیمی تبدیلیوں کو فروغ دیا جو عورتوں کے لیے اہم تھیں۔

اس کے بعد رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۱ تا ۱۸۷۳) نے عورتوں کی تعلیم کے لیے آواز بلند کی وہ الازہر کے تعلیم یافتہ اور پیرس جانے والے تعلیمی مشن کے رکن تھے، ان کا کہنا تھا کہ عورتوں کو وہی تعلیم دی جائے جو مردوں کو دی جاتی ہے ان کی دلیل یہ تھی کہ طاقتور قوموں یعنی یورپی قوموں کے تجربات کا یہی نتیجہ ہے۔[19]

قاسم امین (۱۸۶۵ تا ۱۹۰۸) نے عورت کے حقوق کی بازیابی اور اس کی آزادی کے حصول کے لیے منظم تحریک کی بنیاد ڈالی، اسی بنا پر اس کا نام محرر المراۃ (عورت کو آزادی دلانے والا) پڑ گیا، فرانس کا فارغ التحصیل یہ شخص اسلامی اقدار اور روایات سے بیزار نظر آتا تھا وہ مصری عورت کو یورپی عورت کے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا، اس نے اپنے خیالات کا اظہار اپنی دو کتابوں تحریر المراۃ اور المراۃ الجدیدہ میں کیا ہے۔ اس نے اپنے موقف کی حمایت میں مصری رائے کو ہموار کیا تحریر المراۃ میں اس نے چار مسائل حجاب، زندگی کے جملہ معاملات میں عورت کی شرکت، تعدد ازواج اور طلاق پر طبع آزمائی کی ہے اور جدت کو اسلام کا مسلک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کے معاملے میں روایتی اسلامی فکر کا ناقد ہے حجاب کے ضمن میں اس کا قول ہے کہ قرآن حکیم میں وارد حجاب کا حکم صرف ازواج مطہرات کے لیے تھا۔[20]

مصر میں حقوق نسواں کی فکر کو تقویت دینے والی ڈاکٹر منیر قاضی بھی ہیں، انہوں نے قاسم امین کی طرح آیات قرآنی کی تاویل کی۔ ان میں سے ایک آیت درج ذیل ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ[21]

ترجمہ: اے نبی! جب تیرے پاس مومن عورتیں آئیں، تجھ سے بیعت کرتی ہوں کہ وہ نہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہی ہوں اور نہ کسی نیک کام میں تیری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لے اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا کر۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔

انہوں نے درج بالا آیت سے استدلال کیا کہ عورت بھی مرد کی طرح سیاست میں حصہ لینے کی اہل ہے، نیز مردوں کی طرح وہ بھی حاکم وقت کی بیعت کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر منیر قاضی کی طرح عقیلہ احمد حسین بھی اپنے مضمون میں پردہ، طلاق وغیرہ کے بارے میں اپنے پیشروؤں کی ہم نوا نظر آتی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حق طلاق مرد کو تفویض کرنا عورت پر ظلم اور زیادتی ہے۔[22]

مصر میں خصوصی طور پر تحریک نسواں نے خدیو اسماعیل پاشا کے زمانے (۱۸۶۳ تا ۱۸۷۹) میں زور پکڑا اور عورتوں کے جدید طرز کے سکول کھلنے لگے، خدیو اسماعیل کا کہنا تھا کہ اسکول ہر نوع کی ترقی کی بنیاد ہوتے ہیں۔[23]

مصر میں تحریک حقوق نسواں کی مخالفت

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اسلامی قانون کی ضابطہ بندی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک میں مصر کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔[24] مصر کے نامور ادیب مصطفی لطفی (م ۱۹۲۴) عورت کی تعلیم تربیت کے حامی ہیں لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ عورت حیا کے پردے کو تار تار کرے، مصر کے شعرا نے بھی متجددین کی بے باک آزادی کی دعوت کو مذہب کے خلاف سازش قرار دیا اور مصر کے کثیر شعرا نے تجدد ہونے کے باوجود عورت کی کھلی آزادی کے حق میں نہیں۔ ایک ملی شاعر کہتے ہیں ترجمہ: اس کے باوجود کہ میں نے سونے و چاندی کی طرح تمہاری حفاظت کی ہے (اور اس کے باوجود کہ) میری محبت ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور جو شخص قیمتی چیز سے اعراض کرتا ہے وہ بخل سے کام لیتا ہے۔

حافظ کہتے ہیں۔ ترجمہ: میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کو پردوں کے درمیان بے پردہ چھوڑ دو کہ وہ اسی حالت میں بازاروں میں گھومتی پھرتی رہیں۔

الاخوان المسلمین کی خواتین شاخ، الاخوات المسلمات نے بہت اہم کردار ادا کیا اس کے علاوہ نعمت صلاتی نے التبر جاور مصر کے نامور محقق اور ماہر انشا پرداز محمد فرید وجدی (۱۸۸۷ تا ۱۹۴۵) نے المراۃ المسلمہ لکھ کر اسلام کے نظام عفت و عصمت کا موثر انداز میں دفاع کیا۔[25] مصر میں حقوق نسواں کی جدوجہد میں زینب الغزالی (۱۹۱۷) کا نام بھی نمایاں ہے۔ زینب نے نوجوانی میں ہدی شعرادی کی تحریک نسواں میں شمولیت اختیار کی مگر جلد ہی یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ یہ تحریک آزادی عورتوں کو حقوق کے نام پر اسلام سے گمراہ کر رہی ہے اور یہ کہ اسلام نے خواتین کو ہر قسم کے حقوق فراہم کئے ہیں۔ اس لیے مزید کسی تنظیم سے وابستگی فضول ہے۔ ۱۹۳۶ میں زینب نے جماۃ السیرت المسلمات کی بنیاد رکھی اور مسلمان طالبات میں اسلامی حقوق کا شعور بیدار کیا اس وقت کی حکومت نے تنظیم

کی مقبولیت اور توسیع کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں اس پر پابندی لگادی، اس وقت اس کے ارکان کی تعداد ۳۰ (تیس) لاکھ کے قریب تھی۔[26] مصر میں شافعی فقہ کے مطابق عائلی قوانین نافذ ہیں۔[27]

نافق کمال (۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۸ء) نے ترکی میں عورتوں کی تعلیم کا علم بلند کر رکھا تھا۔ شمس الدین (۱۸۵۰ء تا ۱۹۰۴ء) نے ۱۸۸۰ء میں ایک کتاب کدینار یعنی عورتیں شائع کی، اس میں شمس الدین نے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور کثیر زوجی کے معاملے کی اصلاح وکالت کی۔[28]

تیونس بھی اسی راہ پر گامزن ہے، تیونس کی آزادی کے بعد تین ہی سالوں میں آزادی نسواں نے جو رنگ اختیار کیا ،اس کے بارے میں ابوالحسن ندوی نے پیرس کے ایک اخبار کی رپورٹ نقل کی ہے، جس کی رو سے تعدد ازواج کی آزادی کو محدود و مقید کر دیا گیا ہے، شوہر کے حق طلاق پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں، یہ خاندانی آزادی، سیاسی اور معاشرتی آزادی کے ساتھ ملکر دوچند ہو جاتی ہیں۔ عورتوں کو تیونس میں رائے دہند کی اور مجلس قانون سازی کا ممبر بننے کا حق بھی حاصل ہو چکا ہے۔ تمام ملازمتوں میں عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، پردہ کم ہوتا جارہا ہے، باہر نکلنے والی عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور سیاسی محفلوں میں وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔

افغانستان میں امیر اللہ خان کے دور تک اسلامی روایات اور تہذیب پوری طرح چھائی ہوئی تھی، لیکن اب افغانی قوم بھی تجدد کی اس راہ پر چل پڑی ہے پردہ اب وہاں بھی پسماندگی اور غربت کی علامت بن گیا ہے۔ مغربی لباس ہے۔ عورتوں میں یورپ کے پھیلائے ہوئے کامل مساوات مرد وزن کے نظریہ کے اثرات بہت گہرائی تک اتر چکے ہیں۔

الجزائر، انڈونیشیا اور برصغیر پاک وہند میں بھی اس تجدد پرستی کے یہ اثرات بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں جن سے خاندانی اور قومی زندگی تباہی و بربادی کی راہ پر چل پڑی ہے، البتہ برصغیر پاک وہند میں اسلام پسندی کی جکڑبندی ابھی بھی شدید ہے۔ یہاں تک کہ علماء کی فکر میں بھی عورت کے معاملے میں مغربی افکار کی مزاحمت غالب ہے۔ یہاں کا مذہبی طبقہ تجدد پسندی کو مغربی مغلوبیت کا شاخسانہ قرار دے کر حقوق نسواں کی تعبیر نو یا عورت سے متعلق کسی بھی نئی فکر کا مخالف ہے۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کسی مذہبی معاملے میں انتشار اور محاذآرائی اس خطہ کا خاصہ بنتی جارہی ہے جدید اور قدیم، تجدد پسندی اور روایت پسندی اپنے خدوخال کو نمایاں کرتے جارہے ہیں اور انہوں نے جدید مسلمان عورت کو عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔[29]

ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں، ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد مصر کا جو دستور مرتب ہوا، اس میں بھی عورت کو مرد کے برابر حقوق دیئے گئے۔ ترکی اور ایران بھی کامل طور پر مغربی اثرات کی جولان گاہ ہے۔ روز بروز عام معاشرہ پر دین کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔ عورتوں میں آزادی کا رجحان، اطوار زندگی میں مغرب کی نقالی اور حجاب سے بیزاری،

کلچرل پروگرام، آزادانہ تفریحی مشاغل، مردوں عورتوں کا اختلاط روز افزوں ہے۔ مخلوط تعلیم کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔[30]

نتائج

1. انفرادی اور شخصی حقوق کی اصطلاح کو متقدمین فقہاء اسلام نے مخصوص معنی میں استعمال نہیں کیا۔
2. چرچ کی تقسیم اور صنعتی انقلاب کے زمانے تک مسلمانان عالم بغیر کسی تخصیص اور فرق کے حقوق اللہ کی تعمیل اور حقوق العباد کی پاسداری کرتے چلے آرہے تھے۔
3. مفکرین اسلام اور علماء متاخرین نے قرآن وحدیث کے دلائل کی روشنی میں شخصی وانفرادی حقوق کا تعین فرمایا۔
4. سلطنت عثمانیہ نے ریاستی اور حکومتی سطح پر سب سے پہلے عائلی حقوق کے قوانین نافذ کیے۔
5. مسلم ممالک کی تاریخ میں خواتین کے حقوق کی تحریک کا آغاز مصر سے ہوا۔
6. مغل دور حکومت کے بعد انگریزوں نے ہند کے مسلمانوں کے لیے عائلی قوانین نافذ کیے۔
7. ہندوستان کے علماء نے انگریزوں کے نافذ کردہ قوانین کا تجزیہ کرکے ان کے نقائص وسقم کی نشاندہی فرمائی۔
8. انفرادی و شخصی حقوق کی تقسیم، حقوق نسواں کی تحریکوں اور اس کی روشنی میں تیار کردہ عائلی قوانین نے مسلمانوں کی روایات واقدار اور مقدس ادارہ، نکاح کو بہت متاثر کیا۔

حوالہ جات

[1]۔ عروج احمد قادری، اسلام کے عائلی قوانین، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، ص ۲۹۔

[2]۔ حبیب احمد منہاس، اسلام اور مغرب کا تصور انسانی حقوق کا تحقیقی اور تقابلی جائزہ، جامشورو: سندھ یونیورسٹی، 2008، ص ۱۸۰۔

[3]۔ اسرار الحق، (مترجم وسیم الحق) اسلام اور مغرب کا تصادم، لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ ص ۱۲۴۔

[4]۔ محمد تقی عثمانی، ہمارے عائلی مسائل، ۱۳۴، کراچی، ص ۱۰۔

[5]۔ مظہر مہدی، مسلم معاشرے کی تشکیل نو، دہلی: فینس آفسٹ پریس، ۱۹۹۶، ص ۶۷۔

[6]۔ محمد طاہر قاری، عائلی قوانین اور پاکستانی سیاست، لاہور: جنگ پبلیشرز، ۱۹۹۹ء ص ۳۹۔

[7]۔ اوریا مقبول جان،، روزنامہ ۹۲ نیوز، اتوار ۰۸ نومبر ۲۰۲۰۔

[8]۔ اوریا مقبول جان، روزنامہ (اصل نفرت نکاح سے ہے) ۹۲ نیوز، پیر ۰۶ مئی ۲۰۱۹۔

[9]۔ عرفان خالد ڈھلوں، علم اصول فقہ ایک تعارف، ج ۱، اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی، 2012، ص ۲۶۴۔

[10]۔ خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، لاہور: الفیصل ناشران، 2009، ص ۳۰۰۔

[11]۔ نعیم صدیقی، اسلامی قانون میراث اور یتیم پوتے کی محرومی، ترجمان القرآن، عدد ۵، ۴، جنوری فروری ۱۹۵۴، ج ۴۱، ص ۳۰۴۔

[12]۔ احمد عروج قادری، اسلام کے عائلی قوانین، ص ۲۱۔

[13]۔ محمد رشید فیروز، اسلامی دنیا میں عائلی قوانین کی اصلاح، فکر و نظر، ج ۱، ۱۹۶۳، ص ۶۵۔

[14]۔ عائشہ مدنی، بیسویں صدی میں حقوق نسواں کی تعبیر نو، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴، ص ۴۳۰۔

[15]۔ شبیر احمد، الاضواء، تونس کے عائلی قوانین، شیخ زید مرکز اسلامی، لاہور: جامعہ پنجاب، ص ۸۴۔

[16]۔ عادل قاسمی، اختر امام، قوانین عالم میں اسلامی قانون کا امتیاز، ج ۱، بہار انڈیا: شعبہ تحقیق و تالیف جامعہ ربانی، ص ۱۳۱۔

[17]۔ عائشہ مدنی، بیسویں صدی میں حقوق نسواں کی تعبیر نو، ص ۱۷۸۔

[18]۔ شاہدہ پروین، عصری عائلی مسائل اور اسلامی تعلیمات، علوم اسلامیہ، لاہور: جامعہ پنجاب، ۲۰۰۸، ص ۱۰۱۔

[19]۔ لیلیٰ احمد، مترجم خلیل احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، لاہور: مشعل پاکستان، ۱۹۹۵ء ص ۱۶۹۔

[20]۔ ایضاً، ۱۸۲۔

[21]۔ القرآن۔ سورۃ الممتحنہ آیت ۱۲

[22]۔ لیلیٰ احمد، مترجم خلیل احمد، عورت، جنسی تفریق اور اسلام، ص ۱۸۵۔ .

[23]۔ ایضاً، ۱۷۶۔

[24]۔ تنزیل الرحمٰن، مجموعہ قوانین اسلام، ج ۱، اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۵، ص ۱۰۔

[25]۔ ایضاً، ۱۹۰۔

[26]۔ ایضاً، ۱۹۱۔

[27]۔ زاہد راشدی، اسلام اور انسانی حقوق اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں، گوجرانوالہ: الشریعہ اکادمی، ۲۰۱۱، ص ۱۰۰۔

[28]۔ ابو الحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن، ص ۱۸۰۔

[29]۔ ایضاً، ۱۸۸۔

[30]۔ ایضاً، ۱۷۵۔